© rasailojaraid.com

قرآن کا تصورِ انسان

انیس احمد استاد شعبہ اسلامی تاریخ کراچی یونیورسٹی

دورِ جدید کے ایک نامور مفکر نے آج کی دنیا کا جائزہ لے کر بہت خوب کہا تھا کہ "ہم نے فضاؤں میں پرندوں کی طرح اُڑنا اور سمندروں میں مچھلیوں کی طرح تیرنا تو سیکھ لیا لیکن زمین پر اچھے انسانوں کی طرح رہنا نہ سیکھ سکے"۔

آج کے انسان کا سب سے بنیادی مسئلہ یہی ہے کہ ذرائع و وسائل کی دنیا میں تو اس نے محیر العقول ترقی کر لی ہے، لیکن فکر و اخلاق کے میدان میں زندگی کی شاہراہ اس کے سامنے صاف اور واضح صورت میں آج بھی موجود نہیں ہے۔ اس کی فکر پراگندہ اور سماجی تعلقات نت نئی الجھنوں اور پیچیدگیوں کا شکار ہیں۔ اس کی روح مضطرب ہے اور وہ ایک بہتر دنیا کی تلاش میں سرگرداں ہے، وہ اپنی عقل کو رہنما بنائے نئے نئے سوالات کے حل تلاش کرنے اور بگاڑ کی اصل تک پہنچنے میں لگا ہوا ہے۔ ان حالات میں غور و فکر کا ایک یہ سوال بھی ہو سکتا ہے کہ آج کی دنیا کے سامنے انسان کا جو تصور ہے کہیں وہی خام نہ ہو۔ ظاہر ہے ایک غلط تصورِ انساں پر تہذیب و تمدن کی جو بھی عمارت تعمیر ہوگی، وہ کتنی ہی فلک بوس کیوں نہ ہو، اس کی بنیاد کی خامی اسے متاثر و مجروح کرے گی۔

زیرِ نظر مقالے میں قرآن کے تصورِ انسان کو پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے تاکہ اس تصورِ انسان کے آئینہ میں دورِ جدید کے انسان کے ان مسائل کو سلجھانے کی کوشش کی جا سکے جو اس کو پریشان و سرگرداں کئے ہوئے ہیں۔

قرآن وہ واحد کتاب ہے، جس کا خطاب انسان اور انسانیت سے ہے اور جسے نازل کرنے والا کوئی گوشت پوست اور محدود عقل کا انسان نہیں ہے بلکہ ایک "عقلِ کُل" ایک "قادرِ مطلق" اور ایک "علیم و خبیر" ہستی ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یہ صحیفۂ الٰہی جس ہستی کو مخاطب کرتا اور اس کی ہر آیت اور ہر نشانی جس ذی روح کو مخاطب کرتی ہے اور اس کے ضوابط و حدود جس مقصد کو سامنے رکھ کر مقرر کیے گئے ہیں، وہ صرف انسان اور انسانیت ہے۔ چنانچہ قرآن پاک نے کسی موقع پر بھی فرد کو اپنا مخاطب نہیں قرار دیا بلکہ ہمیشہ "انسان" "انسانیت" اور "گروہ ابنِ آدم" کو اپنا مخاطب گردانا ہے۔

قرآن عہد حاضر کی وہ اوّلین کتاب ہے۔ جس نے انسان کے بارے میں ایک واضح اور متعین نقطۂ نظر پیش کیا ہے۔ جس نے ان مابعد الطبعیاتی مسائل پر حتمی اور قطعی فیصلے کیے ہیں۔ جو مدت ہائے دراز سے فکرِ انسانی میں ایک خلجان برپا کیے ہوئے تھے اور مابعد الطبیعاتی مسائل پر ایسے حتمی فیصلے وہ ذات ہی کر سکتی تھی، جو زمان و مکان کی خالق ہو۔ چناں چہ قرآن پاک نے سب سے پہلے انسان کی اصل اور حقیقت پر روشنی ڈالی ہے اور پھر دنیا میں انسان کی حیثیت، کائنات میں اس کے مقام اور مقصد اور ان اختیارات و فرائض کو متعین فرمایا ہے جو انسان کو عطا کیے گئے ہیں۔

انسان کی حقیقت و ماہیت کیا ہے؟ - یہ سوال ایک مدت سے مفکرین کا موضوع بنا رہا ہے۔ دورِ جدید کے مفکرین مثلاً مارک ڈارون، ٹی ایچ ہکسلے، ہنری برگساں اور لائیڈ مارگن وغیرہ نے تصورِ ارتقاء کی مدد سے انسان کی حقیقت کا سراغ لگانے کی کوشش کی اور بعد از تلاش بسیار یہ کہہ سکے کہ انسان ایک ترقی یافتہ حیوان ہے۔ جو تجرباتی شعور، طبیعاتی انقلابوں، نباتاتی تبدیلیوں اور بعض حادثوں کے سبب وجود میں آیا ہے۔ جس انسان کے آباؤ اجداد چوپائے، اُچھلنے کودنے والے جانور اور درندے ہوں، وہ اپنے ماضی سے کیا رہنمائی حاصل کر سکتا ہے اور اس سے انسانیت کی کیا توقع کی جا سکتی ہے۔ قرآن نے اس کے مقابلے میں انسان کے ایک مستقل اور آزاد وجود کا تصور پیش کیا ہے۔ وہ انسان کو ایک حادثہ کی پیداوار نہیں قرار دیتا، بلکہ ایک سوچے سمجھے منصوبے اور ایک مقدر عمل کا نتیجہ قرار دیتا ہے چنانچہ:-

"جب تیرے پروردگار نے فرشتوں سے کہا کہ میں ایک آدمی سڑی ہوئی کیچڑ سے خمیر کی ہوئی کھن کھن ہونے والی مٹی سے پیدا کرنے والا ہوں ....." (۱۵ - ۲۸)

"کیا ہم نے تمہیں ذلیل پانی سے پیدا نہیں کیا۔ پھر ہم نے اس کو ایک محفوظ قرارگاہ میں رکھا ایک مقررہ وقت تک، پھر ہم نے اندازہ ٹھہرایا۔ سو ہم کیا اچھا اندازہ کرنے والے ہیں" (۷۷ - ۲۰)

"جب تمہارے رب نے فرشتوں سے کہا تھا کہ میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں" (البقرہ - ۳۰)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ان آیاتِ قرآنی سے بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ (۱) تخلیقِ انساں ایک حادثاتی امر نہیں ہے۔

۲: تخلیقِ انساں ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت ہوئی ہے (۲ - ۳)

۳: انسان ایک مستقل اور آزاد وجود کا مالک ہے۔ یہ کسی ارتقائی عمل کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ ابتدا ہی سے انسان کی شکل میں بنایا گیا ہے۔ چنانچہ ارشادِ ربانی ہے :" ہم نے تمہاری تخلیق کی ابتدا کی۔ پھر تمہاری صورت بنائی۔ پھر فرشتوں سے کہا آدم کو سجدہ کرو۔" (اعراف - ۱۱)

" تصوّر کرو اس وقت کا جب تمہارے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں ایک بشر مٹی سے پیدا کرنے والا ہوں۔ پھر جب اسے پوری طرح تیار کر لوں اور اس کے اندر اپنی روح پھونک دوں تو تم سب اس کے آگے سجدہ میں گر جانا۔" (ص - رکوع ۵)

انسانی جسم میں روح کا پھونکا جانا یہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ محض ایک مادی وجود نہیں ہے۔ اس کے علاوہ کچھ اور بھی ہے۔ پھر یہ کہ روزِ اوّل سے انسان کا ایک آزاد وجود ہے۔ وہ نہ تو محض حیوانِ ناطق ہے اور نہ ہی کوئی متمدن جانور، بلکہ ابتدا ہی سے ایک آزاد مخلوق کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس نے عقل و شعور نباتاتی نشو و ارتقاء سے اکتساب نہیں کی ہے بلکہ روزِ اوّل سے ہی اسے عقل و شعور اور ارادہ کی قوت سے نوازا گیا ہے جس کے ساتھ ہی اس پر بعض اخلاقی ذمہ داریاں بھی عائد کی گئی ہیں۔

انسان کے وجود کے بارے میں ایک مثبت اور واضح تصوّر دینے کے بعد قرآن دنیا میں انسان کی حیثیت پر روشنی ڈالتا ہے۔ چنانچہ تخلیقِ آدم سے قبل اللہ تعالیٰ فرشتوں کے سامنے اپنے ارادہ کا اظہار ان الفاظ میں فرماتا ہے:۔

"واذ قال ربك للملٰئكة انى جاعل فى الارض خليفة" (البقرہ - ۳۰)

(ترجمہ) جب تمہارے رب نے فرشتوں سے کہا تھا کہ میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔"

گویا دنیا میں اللہ کے اس خلیفہ کی حیثیت کسی ادنیٰ مخلوق یا کائنات کے ایک ناقابلِ التفات جزو کی نہ تھی بلکہ اسے کائنات کے مرکز و محور ہونے کا شرف حاصل تھا۔ وہ کائنات کے کسی تغیّر و تبدّل سے وجود میں نہیں آیا بلکہ کُل کائنات کو اس کے لئے پیدا کیا گیا۔ چنانچہ تخلیقِ آدم کے وقت فرشتوں کا حضرت آدمؑ کو سجدہ کرنا گویا علاماتی حیثیت سے پوری انسانیت کو سجدہ کرنا تھا۔ قرآن انسان کی مرکزیت اور بلندی کو ان الفاظ میں تسلیم کرتا ہے:۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

"و سخر لکم اللیل و النہار و الشمس و القمر و النجوم" اس نے تمہاری بھلائی کے لئے رات اور دن کو اور سورج اور چاند کو مسخر کر رکھا ہے اور سب تارے بھی اس کے حکم سے مسخر ہیں ..... وہی جس نے تمہارے لئے سمندر کو مسخر کر رکھا ہے تاکہ تم اس سے تر و تازہ گوشت لے کر کھاؤ۔ اس سے زینت کی وہ چیزیں نکالو جنہیں تم پہنا کرتے ہو۔ تم دیکھتے ہو کہ کشتی سمندر کا سینہ چیرتی ہوئی چلتی ہے۔ یہ سب کچھ اسی لئے ہے کہ تم اپنے رب کا فضل تلاش کرو اور اس کے شکر گزار ہو۔"

یہاں پر قرآن نے بنیادی طور پر اس نظریہ کا ابطال کیا ہے کہ انسان اس کائنات کا ایک 'ساختہ' ہے۔ اس کے برعکس قرآن ایک مثبت تصور پیش کرتا ہے کہ انسان کو کائنات میں مرکزی حیثیت حاصل ہے اور کائنات کی ہر شے اس کے لئے مسخر یعنی 'معاون' کر دی گئی ہے۔ تمام قوانینِ فطرت کو اس امداد کی بنیاد پر بنایا گیا ہے۔ انسانی فکر کا جائزہ لیجئے تو معلوم ہوگا کہ ہمارے 'عظمتِ آدم' اور تفوقِ انسانیت کے تصورات انسان کو وہ بلندی اور اہمیت دینے میں ناکام ہو چکے ہیں جو قرآن مجید نے اس کو عطا کیا ہے۔

(۲)

انسان کی اس عظمت اور بلندی کا مقصد کیا ہے۔ یہ وہ بنیادی سوال ہے جسے قرآن نے اس طرح پیش کیا ہے کہ یہ تمام عظمت و بلندی صرف اس لئے ہے کہ انسان شکر گزار بنے، اس کے مقابلے میں انسان کی روش یہ رہی ہے کہ اس اہمیت اور بلندی نے اسے اپنے بارے میں سخت غلط فہمیوں میں مبتلا کر دیا۔ اس نے جب قوانینِ فطرت کو اپنے ساتھ تعاون کرتے اور فطرت کی عظیم قوتوں کو اپنے سامنے سجدہ ریز ہوتے دیکھا، تو یکایک اپنے اندر الوہیت کی صفات محسوس کرنے لگا۔ قرآن اس روش کو ناشکر گزاری سے تعبیر کرتا ہے۔ انسان کے اس طرزِ عمل کو قرآن میں مختلف مقامات پر بیان کیا گیا ہے، ملاحظہ ہو بنی اسرائیل - ۱۱، ۱۰ ابراہیم - ۳۴، بنی اسرائیل ۶۷ - ۲، السجدہ - ۴۹، الشوریٰ - ۴۸، اعراف ۱۹، عبس ۱۷، فجر ۱۵، بلد ۱، عادیات ۶، حج ۶۶، روم ۲۳، سجدہ ۷، زمر ۸، اعراف ۱۰، روم ۲۶، السجدہ ۴۹ -

قرآن نہ تو انسان کو حقیر و ذلیل کر کے پیش کرتا ہے اور نہ اسے اپنی الوہیت کے دھوکے میں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مبتلا ہونے دیتا ہے۔ وہ پہلے انسان کو اس کی حقیقت کا احساس ان الفاظ میں دلاتا ہے کہ:۔

"بے شک انسان پر زمانے میں ایک ایسا وقت بھی گزر چکا ہے کہ وہ کوئی چیز قابلِ تذکرہ نہ تھا۔" (الدھر۔ ۱)

اور پھر انسان کو ایک منصبِ عظیم یعنی "خلافت فی الارض" پر فائز کرتا ہے۔ گویا قرآن انسان کو اوّل ان غلط اور خود ساختہ بلندیوں سے اتار کر اس کی حقیقت اس پر آشکار کرتا ہے اور اس کے بعد دوبارہ انسان کو حقیقی بلندیوں کی طرف لے جاتا ہے۔ یہاں ارتقاء کی سمت کم تر سے بلند تر کی طرف ہے۔ یہی تصورِ ارتقاء انسان کو کسی احساسِ کم تری میں مبتلا کرے بغیر عظمتِ آدم کا صحیح تصور دیتا ہے۔

انسان کو مرکزِ کائنات بنانے کے بعد ضروری تھا کہ انسان کو حق و باطل میں تمیز کرنے اور فیصلہ کرنے کا حکم بھی دیا جائے۔ یہ حکم کسی تجربہ کی صورت یا کسی مسلسل عمل کے نتیجہ میں ظاہر نہیں ہوا۔ بلکہ تخلیقِ آدم کے ساتھ ہی انسان کو دے دیا گیا۔ چنانچہ سورۂ بقرہ میں ارشاد ہوتا ہے "وعلم آدم الاسماء کلھا" یعنی اس کے بعد اللہ نے آدم کو تمام چیزوں کے نام سکھلا دیئے۔ یہ وہ خصوصیت تھی جو انسان کو فرشتوں پر فوقیت عطا کرتی ہے اور یہی علم کی صفت انسان کو دیگر تمام مخلوقات سے ممتاز کرتی ہے۔ لیکن انسان کو صرف علم دینا کافی نہ تھا۔ علم محض کبھی بھی عمل کا بدل نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ عمل کی اصلاح کے لئے قرآن نے انسان کو ایک طرف تو ارادہ اور اختیار کی صلاحیت دی اور دوسری طرف اس ارادہ و اختیار کو استعمال کرنے کے لئے بعض محرکات بھی فراہم کر دیئے تاکہ ارادہ و اختیار صحیح سمت میں حرکت کر سکیں چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:۔

"...... مگر (اللہ کی حیثیت یہ نہ تھی کہ وہ لوگوں کو جبراً اختلاف سے روکے اس وجہ سے) انہوں نے باہم اختلاف کیا۔ پھر کوئی ایمان لایا اور کسی نے کفر کی راہ اختیار کی۔ ہاں اللہ چاہتا تو وہ ہرگز نہ لڑتے مگر اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔" (البقرہ۔ ۲۵۳)

"یہ مشرک لوگ ضرور کہیں گے کہ اگر اللہ چاہتا تو ہم شرک نہ کرتے۔ نہ ہمارے باپ دادا۔ بے شک اگر اللہ چاہتا تو تم سب کو ہدایت دے دیتا ......" (انعام۔ ۱۴۸)

"اور لوگوں کو جب ان کے پاس ہدایت آ چکی، کوئی چیز اس بات سے کہ وہ ایمان لائیں، اور اپنے پروردگار سے معافی مانگیں روکنے والی نہیں ہے ......" (الکہف ۱۸۔ ۵۵)

"اسی طرح ہم نے اس کو (نیکی اور بدی کی) راہیں دکھلا دیں" (۹۱۔ ۱۰)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

گویا اللہ تعالیٰ نے یہ پسند نہیں فرمایا کہ انسان کو بھی فرشتوں کی طرح 'ھدایت یافتہ' بنا دے یعنی وہ بُرائی پہ قادر ہی نہ ہو بلکہ اس نے انسان کو یہ اختیار دیا کہ وہ اگر چاہے تو بُرائی سے اجتناب کرے اور اگر چاہے تو اسے اختیار کرے۔ اسی علت کے سبب حیات بعد الموت میں جواب دہی کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ چنانچہ قرآن انسان کو علم، عقل، ارادہ و اختیار سے آراستہ کرنے کے بعد اور یہ یاد دہانی کرانے کے بعد کہ وہ درحقیقت ایک ذمہ دار اور ذی شعور مخلوق ہے، جسے ان فرائض و ذمہ داریوں کو ادا کرنا ہے جو اس کے خالق نے اس پر عائد کی ہیں، عمل کے لیے خود مختار چھوڑ دیتا ہے۔ وہ کوئی پابندی ایسی نہیں لگاتا کہ انسان کسی ایک راستہ پر چلنے پر مجبور ہو۔ ارشاد ربانی ہے:۔

"جو صاف صاف ہدایت تمہارے پاس آچکی ہیں اگر اُن کو پا لینے کے بعد بھی تم نے لغزش کھائی تو خوب جان رکھو کہ اللہ سب پر غالب اور حکیم و دانا ہے۔ کیا اب وہ اس کے منتظر ہیں کہ اللہ بادلوں کا چتر لگائے فرشتوں کے پرے ساتھ لئے خود سامنے آموجود ہو اور فیصلہ کر ہی ڈالا جائے۔ آخر کار سارے معاملات پیش تو اللہ کے حضور میں ہونے والے ہیں" (۲ - ۲۰۹ - ۲۱۰)

گویا قرآن انسان سے اس بات کا متمنی ہے کہ وہ دلیل کھل کر سامنے آجانے کے بعد بلا جھجک اپنی قوت اختیار کا استعمال کرتے ہوئے اپنے لئے سواء السبیل کا انتخاب کرے گا۔ وہ ایمان کی قدر و قیمت اسی میں سمجھتا ہے کہ بدی پر اختیار ہونے کے باوجود انسان بدی کا ارتکاب نہ کرے اور نیکی کو اختیار کرلے۔ لیکن چونکہ انسان کو محدود صلاحیتیں دی گئی ہیں، اس لیئے قرآن انسان کو بغیر کسی پاسبان عقل کے چھوڑ دینے کا قائل نہیں ہے۔ انسان کبھی اپنے داخل کا کلی طور پر انکار نہیں کرسکتا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کا نقطۂ نظر کسی معاملے پر بھی مکمل خارجی نہیں ہو سکتا اور یہی وجہ ہے کہ انسان ہمیشہ کسی بیرونی ہدایت اور بیرونی ذریعہ علم کا حاجت مند رہا ہے۔ قرآن اس سلسلے میں اللہ تعالیٰ کے عنایت کردہ نظامِ زندگی کو بطور ایک حل کے پیش کرتا ہے۔ یہ تصورِ حیات ایک ایسی ہستی کا ترتیب دیا ہوا ہے جو علیم و خبیر اور بصیر ہے۔ ہر قسم کی غرض اور خطا سے پاک ہے۔ اس لئے یہی ضابطہ حیات ایک معروضی (OBJECTIVE) معیار پہ پورا اتر سکتا ہے۔

(۳)

قرآن پاک انسان کی حقیقت کائنات میں اس کے مقام اور مقصد سے بحث کرتے وقت ا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کی دنیاوی زندگی کو ایک ایسے "تجرباتی احساس" سے تعبیر کرتا ہے جس کی کوئی دائمی حیثیت نہیں ہے۔ جو محض حقیقت کا ایک سایہ اور پرتو ہے۔ چنانچہ قرآن دنیاوی زندگی کی بے ثباتی اور آخرت کی حقیقی اور ابدی زندگی کا انتہائی واضح نقشہ کھینچنے کے بعد منکرینِ آخرت سے پوچھے جانے والے ایک سوال کا تذکرہ ان الفاظ میں کرتا ہے:" اس وقت اس کا رب اس سے پوچھے گا کہ کیا یہ حقیقت نہیں ہے۔ یہ کہیں گے ہاں اے ہمارے رب یہ حقیقت ہی ہے .... (انعام ۲۴-۳۴)

قرآن کریم کی رو سے یہ دنیا انسان کا مستقل اور دائمی مسکن نہیں بلکہ ابدی زندگی کی تمہید ہے۔ اور اس کی حیثیت ایک مختصر اور متعین مدت کے لئے ترتیب دی ہوئی امتحان گاہ کی سی ہے۔ اس چیز کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں بیان فرمایا ہے کہ الدنیا مزرع الآخرۃ دنیا آخرت کے لئے کھیتی کی حیثیت رکھتی ہے یعنی جو کچھ یہاں بوؤ گے وہاں کاٹو گے۔ قرآن انسان کو مشاہدہ محض کی دنیا سے نکال کر مشاہدہ حق کی طرف لے جانا چاہتا ہے۔ چنانچہ بار بار انسان کو یہ دعوت دی جاتی ہے کہ وہ آیاتِ الٰہی میں غور کرے اور پسِ پردہ جو حکمت کارفرما ہے، اُس کا احساس و مشاہدہ کرے۔

(۴)

قرآن ہمیں جو تصورِ انساں دیتا ہے، وہ نہ تو معصوم کہا جا سکتا ہے اور نہ پیدائشی طور پر گنہگار ہی، بلکہ ہم اسے ایک بااختیار انسان کا تصور کہہ سکتے ہیں۔ کچھ مذاہب نے یہ تصور پیش کیا کہ انسان پیدائشی طور پر گناہ گار ہے۔ قرآن اس تصور کی تردید تخلیقِ آدم کے واقعہ سے کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے:" اس وقت آدم نے اپنے رب سے چند کلمات سیکھ کر توبہ کی جس کو اس کے رب نے قبول کر لیا کیونکہ وہ بڑا رحم کرنے والا ہے۔ ہم نے کہا کہ تم سب یہاں سے اُتر جاؤ۔ پھر جو میری طرف سے کوئی ہدایت تمہارے پاس پہنچے تو جو لوگ میری اس ہدایت کی پیروی کریں گے، اُن کے لئے کسی خوف اور رنج کا موقع نہ ہوگا۔ (۲-۳۷-۳۸)

قرآن واضح طور پر تردید کرتا ہے کہ آدم کو کسی گناہ کی پاداش میں دنیا میں بھیجا گیا۔ اس موقع پر قرآن کی دوسری سورت کی اس آیت کا مفہوم ذہن میں رکھا جائے جس میں اللہ تعالےٰ تخلیقِ آدم کے ارادہ کا اظہار فرشتوں کے سامنے فرماتا ہے تو یہ نہیں کہا جاتا کہ میں جنت میں رکھنے کے لئے ایک انسان بنا رہا ہوں بلکہ یہ کہا جاتا ہے کہ "میں اپنا خلیفہ بنانے والا ہوں"۔ اوّل الذکر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

آیت میں واضح طور پر حضرت آدم کی توبہ کی قبولیت کے اعلان کے بعد انسان کے "اوّلین گناہ" کا تصور باقی نہیں رہتا۔ قرآن اس بات کی بھی تردید کرتا ہے کہ حضرت آدم کو ترغیب میں حضرت حوّا کا حصہ تھا بلکہ وہ ان مرد اور عورت دونوں کو مساوی طور پر نفس کے بہکانے میں آجانے والا قرار دے کر دونوں کی معافی کا اعلان کرتا ہے اور ان کی بھول کو حرفِ غلط کی طرح مٹا کر انہیں پاک و صاف قرار دینے کے بعد زمین پر اپنے نائب کی حیثیت سے بھیجتا ہے۔ گویا قرآن کسی پیدائشی گناہ گار انسان کی جگہ ایک صحت مند اور قوی ارادہ انسان کا تصور پیش کرتا ہے۔ قرآن انسان کی عظمت، گناہ نہ کرنے میں نہیں قرار دیتا بلکہ گناہ کی صلاحیت کے باوجود گناہ سے دامن بچا جانے اور بصورت دیگر ندامت، غلطی کے اعتراف اور مائل بہ اصلاح ہونے میں قرار دیتا ہے۔

قرآن انسان کی انفرادی ذمہ داری کے ساتھ اس کی اجتماعی ذمہ داری کو بھی غیر معمولی اہمیت دیتا ہے، قرآن کا انسان اعتقادات کو اپنا ذاتی معاملہ نہیں سمجھتا بلکہ وہ ایک معاشرہ اور ایک عالم گیر برادری کے رکن کی حیثیت سے امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے فریضہ کی انجام دہی کے لئے کمربستہ نظر آتا ہے۔ ایمان کے کلمہ جامعہ کا اقرار کرتے ہی ایک شخص ایک طرف خدا سے جڑ جاتا ہے تو دوسری طرف ایک اُمت کا جزو بھی بن جاتا ہے۔ دونوں عمل بیک وقت رونما ہوتے ہیں۔ یہ اُمت صرف عقیدہ، ایمان اور اخلاق کی بنیاد پر مبنی ہے۔ یہی وہ واحد اصولی فرق و امتیاز ہے، جسے اسلام پیش کرتا ہے۔ وہ تمام انسان جو خلافت فی الارض کی ذمہ داری کو شعوری طور پر اُٹھاتے ہیں، ایک اُمت بن جاتے ہیں۔ یہی اُمت وسط ہے اور وہ تمام انسان جو اس حق کا انکار کرتے ہیں، ایک دوسرے گروہ میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ حدیثِ نبوی میں آتا ہے کہ "الکفر ملۃ واحدۃ" قرآن کا انسان مطلوب ایک حق گو اور حق شناس ہستی ہے، جو انفرادی زندگی کے ساتھ ہی اجتماعی زندگی میں بھی اصلاح و تہذیب میں مصروف نظر آتی ہے۔

(۵)

قرآن ہمیں جو تصورِ انسان دیتا ہے، وہ مساواتِ انسانی پر مبنی ہے۔ وہ کسی نسل کی برتری، رنگ کی تفریق یا زبان کے تعصب کو راہ نہیں دیتا، بلکہ اس بات کا اعلان کرتا ہے کہ "لوگو! اپنے رب سے ڈرو، جس نے تم کو نفسِ واحدہ سے پیدا کیا اور اسی جان سے اس کا جوڑا بنایا اور ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورت دنیا میں پھیلا دئے ...." (النساء - ۱)

© rasailojaraid.com